بابِ اوّل

معارف کے پس منظر کا تاریخی جائزہ

① برصغیر میں مسلمانوں کا دورِ انحطاط

رسالہ معارف کے مکمل تعارف و تجزیہ سے پہلے ضروری ہے کہ ان عوامل و اسباب کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایسی علمی و تعلیمی تحریکیں رونما ہوئیں جن کو بجا طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کے علوم و معارف کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نے برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا ایک اجمالی جائزہ لیا ہے اور عہد زوال کی سیاسی، معاشرتی اور نتیجتہً تعلیمی و علمی انحطاط اور پستی کی ایک تصویر پیش کی ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا سرسری جائزہ ادھر اٹھارہویں صدی کی ابتداء ہوئی اور ادھر برصغیر کے مسلمانوں کے اقبال کا سورج گہنا گیا۔ مصائب و آلام اور حوادث و حسرات کے بادل امنڈ امنڈ کر آنے لگے اور انقلابات و اتفاقات کا تانتا سا بندھ گیا۔ رزم ہو یا بزم جمود و تعطل کے تاریک سائے دراز ہوتے گئے اور بے حسی و بے عملی کے مظاہر کی کثرت ہوتی گئی۔ 1707 میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات ہندی مسلمانوں کے ستارۂ اقبال کے ڈھلنے کی علامت بن گئی۔

نااہل حکمرانوں نے اپنی ناسمجھیوں اور کمزوریوں سے ایک طرف اپنے اولوالعزم اسلاف کی کی کرائی اور بنی بنائی پر پانی پھیر دیا اور دوسری طرف اس ملک کی وسعتوں میں صدیوں سے بے خوفی کی زندگی گزارنے والی اپنی ہم قوم اقلیتی رعایا کی ساکھ کو مٹا کر زبردست سیاسی و سماجی انتشار کی زد میں لاکھڑا کیا۔ اورنگزیب کے مرتے ہی شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ آخر شہزادہ معظم کامیاب ہوا اور ابوالنصر قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت طاؤس پر رونق افروز ہوا لیکن بمشکل پانچ سال حکومت کر سکا۔ اس کے مرنے کے بعد تخت و تاج کے حصول کی خاطر حسب روایت شاہانہ جدال و قتال کے نتیجے میں اس کا بڑا لڑکا ابوالفتح معز الدین جہاندار شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے اس زوال کی ابتداء ہوتی ہے

جس کی انتہا 1857 میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے ہاتھوں ہوئی ۔ وہ طبعاً عیش پسند تھا ۔ خافی خان کا بیان ہے کہ اس کے عہد میں رود و سرود کا بازار ایسا گرم ہوا کہ قریب تھا کہ قاضی قرابہ کش اور مفتی پیالہ نوش ہو جائیں گے ۔[1] ایک ادنیٰ درجے کی عورت لال کنور نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ سلطنت کے معاملات میں دخیل ہو گئی ۔ اسے امتیاز محل کا خطاب دیا گیا اور دو کروڑ سالانہ علاوہ ملبوسات و جواہرات ذاتی اخراجات کے لیے منظور کیے گئے ۔[2] جہاندار شاہ کے بھتیجے فرخ سیر نے حکومت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھایا اور سادات بارہہ کی مدد سے لشکر کشی کی لیکن اس شان سے کہ طوائفوں اور سازندوں کا ایک طائفہ بھی ہمرکاب لشکر شاہی تھا ۔ اس چپقلش کے نتیجے میں جہاندار شاہ پہلے محبوس ہوا اور پھر قتل کر دیا گیا ۔ فرخ سیر کا حکومت پر قبضہ ضرور ہو گیا لیکن اب تخت و تاج کے حقیقی مالک سادات بارہہ تھے ۔ ملک کی اس سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے جو اورنگ زیب کے وقت میں سرد پڑ چکے تھے از سر نو ہندوستان پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا ۔ سکھ الگ لوٹ مار اور غارت گری پر اتر آئے ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا اور ایک ایسے تنگ و تاریک قید خانہ میں مقید کر دیا گیا جہاں ایک طشت و آفتابہ اور ایک صراحی کے سوا کچھ اور نہ تھا ۔[3] کچھ دنوں بعد اسے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ رفیع الدرجات کو اور پھر سال ہی بھر بعد اس کے بھائی رفیع القدر کو شطرنج کا بادشاہ بنا دیا گیا ۔ اس کے بعد کم عمر شہزادہ روشن اختر نے ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے مغلیہ تاج شاہی سر پر رکھا ۔ اس دوران

---

[1] [3] منتخب اللباب جلد دوم —— خافی خان ص ۶۸۹ + ص ۸۱۲

[2] LETTER MOGHALS جلد اول —— ولیم اروِن ص ۱۹۴

نوٹ : مذکورہ بالا حوالہ جات و متعلقہ تفصیلات مقدمہ "مرزا مظہر جانجاناں" — عبدالرزاق قریشی سے ما

امراء کی کوششوں سے سادات بارہہ کا خاتمہ بھی ہو گیا اور اب یہ امید ہو چلی تھی کہ حالات روبہ اصلاح ہوں گے لیکن یہ امید بھی امید موہوم ثابت ہوئی۔ محمد شاہ بھی امرائے مقتدر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا اور لہو ولعب میں وقت گزارنے لگا جس کی تقلید اراکین سلطنت اور صاحبان دولت کے علاوہ عوام بھی کرنے لگے۔ اب شیردل بابر، حوصلہ مند اکبر اور مجاہدانہ زندگی بسر کرنے والے اورنگ زیب کی اولاد شمشیر وسناں کی بجائے طاؤس و رباب کی طرف مائل تھی۔ دہلی ارباب نشاط اور شاہدان بازاری کا مرکز بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ بدنام بادشاہ تاریخ میں 'رنگیلے' کے لقب سے نوازا گیا اور اس کی ناعاقبت اندیشی کے نتائج اہل دہلی کو بھگتنے پڑے۔ 1738 میں بادشاہ امراء اور رعایا کی شامت اعمال نے صورت نادر اختیار کی۔ نادرشاہ کے سفاکانہ حملے اور اس کے سپاہیوں کی قتل وغارت گری نے دلّی کو ویران کر دیا۔ محمد شاہ کو ۲ کروڑ روپیے تاوان جنگ کے طور پر نادرشاہ کو ادا کرنے پڑے، لوٹ کا مال اس کے علاوہ تھا۔ بعض مورخین نے ۷۰ کروڑ کا اندازہ لگایا ہے۔ مال غنیمت میں شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی تھا۔ محمد شاہ کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا ابوظفر مجاہدالدین احمد شاہ تخت نشین ہوا تو وہ بھی اپنے باپ کا سچا جانشین نکلا۔ اول تو محمد شاہ نے نہ تو اسے کسی قسم کی تعلیم دی تھی اور نہ شاہانہ تربیت کی تھی اس لئے اس کی خامکار طبیعت سلطنت کے بارگراں کی متحمل نہ ہو سکی اور اس نے تمام شاہی اختیارات جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاتھ میں دیدیئے اور خود لہو ولعب میں مصروف رہنے لگا۔ اس کی ذہنیت اس قدر پست ہو گئی تھی اور اس سے ایسے افعال سرزد ہونے لگے جنھیں ملک کے دامن پر ایک بدنما داغ کہا جا سکتا ہے۔[1] احمد شاہ کے بعد معزالدین جہاندار شاہ کا لڑکا اور شاہ عالم بہادر شاہ کا پوتا عزیزالدین عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اخلاقی حیثیت سے وہ بھی پست تھا۔ روز بروز مرکز کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے ملک میں مختلف باغیانہ طاقتیں ابھر آئیں اور طوائف الملوکی کی بدترین

---

[1] زوال سلطنت مغلیہ جلد اول ـــــ سرجادوناتھ سرکار صـ ۳۳۹
ماخوذ از "تذکرہ، مرزا مظہر جانجاناں" ـــ عبدالرزاق قریشی

صورت پیدا ہوگئی ۔ دکن میں شورش برپا ہوئی، جاٹوں نے اودھم مچائی، روہیلوں نے ملک گیری کی ہوس کی، سکھ آمادۂ فساد ہوئے، مرہٹوں نے سلطنت کے خواب دیکھنے شروع کئے، امراء وزراء نے سازشوں کے جال بچھائے، فوج میں ابتری پھیل گئی، اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ انگریز ملک کے ان نفاق انگیز حالات سے اور امراء کے غدارانہ روّیے سے خاطرخواہ فائدہ اٹھانے لگے اور انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہونے لگیں ۔ مغلیہ سلطنت کو جوں جوں زوال آتا گیا انگریزی سلطنت کی بنیادیں اسی قدر مستحکم ہوتی گئیں اور اس کی حدود میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا ۔

امراء کے باہمی نفاق نے سلطنت کو بے حد کمزور اور حالات مخدوش بنا دیا تھا ۔ خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا ۔ عہد عالمگیری میں دکن کی پے در پے لڑائیوں کے نتیجے میں کروڑوں روپئے صرف ہوئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود اورنگزیب کے حسن انتظام کی بدولت ملک کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر نہ پڑا ۔ اس نے ۲۴ کروڑ روپئے آگرہ کے قلعے میں چھوڑے تھے * مگر اس کے جانشینوں کی غلط فیاضیوں اور عیاشیوں نے بہت جلد خزانہ خالی کر دیا ۔ چونکہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہت سے صوبے خود مختار ہو گئے تھے جن پر جاٹوں اور مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا اس لئے لگان کی رقم بھی بے حد کم ہو گئی تھی ۔ یہاں تک کہ ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ ثانی کا زمانہ آیا ۔ یہ بھی اپنے پیش رؤں کی مانند عیاش اور نا اہل ثابت ہوا ۔ اس کے دور میں مغلیہ سلطنت کے حدود و اختیار کی بابت کسی دل جلے نے پھبتی کسی تھی "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم"

1757 میں پلاسی کے مشہور میدان میں جو نتائج سامنے آئے اس نے ایک ابھرتی ہوئی قوم کو نئے خطوط پر سوچنے کا موقع فراہم کر دیا ۔ فرنگی مقامروں نے اپنی مشہور عام روایتی مکاری سے کام لیکر ایسا پانسہ پھینکا کہ بساطِ سیاست ہی کو الٹ کر رکھ دیا ۔ ان غیر ملکی شاطروں نے ایک طرف اپنے دیسی حلیفوں سے جوڑ توڑ اور ساز باز کر کے یعنی DIVIDE AND RULE کی پالیسی اختیار کر کے اور دوسری طرف علمی و فنی مہارت میں تفوق اور سبقت حاصل کر کے نہ صرف یہ کہ تکنیکی مہارت کو وقت کی کسوٹی پر ثابت کر دیا بلکہ خود اپنی اہلیت و اہمیت کے لئے مستند ثبوت فراہم کر دئے ۔ لارڈ کلائیو نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست فاش ہی نہیں دی اور اپنے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ کو دور ہی

---

* مذکورہ حالات از اورنگزیب تا شاہ عالم مقدمہ 'مرزا مظہر جانجاناں ― عبدالرزاق قریشی' کی تفصیلات کی تلخیص اور نفسِ مضمون ہے ۔

نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی عسکری قوت کے کمزور پہلوؤں کو طشت از بام کر دیا اور مشرق بعید تک ان کی عظمت کا جنازہ نکال دیا۔ فدایان وطن کے حوصلوں پر اوس پڑ گئی اور غداران وطن کی ریشہ دوانیوں کے لئے مستحکم راہیں استوار ہو گئیں اس المیہ نے مسلمانوں کو خاص طور پر دار و رسن کی آزمائش میں اس طرح جکڑ دیا کہ آنے والا ہر لمحہ اس گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر ہی کرتا چلا گیا۔ 1761 میں پانی پت کی تیسری لڑائی کی صورت میں برصغیر کے مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کا ایک نادر و نایاب موقع ملا لیکن مختلف اسباب اور عوامل کی بنا پر بڑی تیزی سے یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی حقیر سی جماعت نے مرہٹوں کی ٹڈی دل افواج کا منہ پھیر دیا' ان کا نوجوان حوصلہ مند کمانڈر انچیف سداشیو راؤ بھاؤ گرفتار ہوا اور شمالی ہندوستان میں ابھرتی ہوئی اس عظیم طاقت کی کمر اس طرح توڑ کر رکھ دی کہ اپنے آبائی مرہٹواڑے کے علاوہ ان کے قدم دوبارہ شمالی ہندوستان میں جم نہ سکے۔ مگر ابدالی کی واپسی نے بنے بنائے کھیل کو بگاڑ کر رکھ دیا اور متحارب طاقتوں کو دلی سلطنت کی بے بسی اور کسمپرسی کا فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی کا بھرپور موقع فراہم کر دیا۔ 1765 میں دلی کے برائے نام بادشاہ شاہ عالم نے بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی بلا شرکت غیرے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کر دی' گویا عملاً خود کو بے بس و بے اختیار اور انگریزوں کو با اختیار اور صاحب اقتدار تسلیم کر لیا جو تاریخ ہند کا ایک عظیم المیہ ثابت ہوا۔ 1799 میں سری رنگا پٹم کی آخری لڑائی میں ٹیپو سلطان نے نہایت بہادری کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ میدان کارزار لاشوں سے اس طرح پٹا پڑا تھا کہ مشعلیں جلا جلا کر گھنٹوں کی تلاش بسیار کے بعد سلطان کی لاش دستیاب ہو سکی جس کو دیکھ کر جنرل ہارس کو اپنی بدحواسی پر اطمینان کا سانس لینے اور یہ تاریخی جملہ ادا کرنے کا موقع مل سکا ' آج سے ہندوستان ہمارا ہے'۔[6] لیکن اتنی دیر کے بعد بھی اس غیرت مند سلطان کی لاش گرم اور تلوار کے قبضہ پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی[7] 1831 میں حریت پسندوں کی ایک اور منظم اور مخلصانہ کوشش ناکام ہو گئی۔ بالاکوٹ کی لالہ زار وادیوں میں

---

[5] LETTER MOGHALS جلد اول ــــ ولیم اردن ص ۲۱

[6] سلطان ٹیپو ــــ ڈاکٹر کمال الدین اشرف ص ۱۱۵

[7] سلطنت خداداد ــــ ڈاکٹر عبداللہ جمالی ص ۳۱۲

نوٹ: حوالہ جات ۱ تا ۵ ماخوذ از مقدمہ ' مرزا مظہر جانجاناں ۔ عبدالرزاق قریشی '

ڈھاک کے سرخ پتوں نے آگ سی لگادی۔ امیر المومنین سید احمد شہید کی جماعت کے فدائین کی صف آرائی سے پہلے ہاتف نے صدا لگائی "پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی" اور حریت پسندوں نے بڑی بے جگری سے خاک وخون میں لوٹ کر ثابت کردیا "باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں"۔ لیکن اس شکست و ریخت کے نتائج نے ایک طرف اگر اس تحریک کے نام لیواؤں پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے تھے تو دوسری طرف ملت کے جامد و ساکت قلوب میں سرفروشی کی تمنا پیدا کردی۔ 1857 برصغیر کے مسلمانوں کے حق میں قیامت صغریٰ بن گیا۔ وہ اپنی علمی و فنی صلاحیتوں کو یکجا کرکے کوئی ایسا لائحہ عمل نہیں پیش کرسکے جو ان کی اقبال مندی کے سورج کو ڈوبنے سے بچا سکتا۔ نتیجہ کے طور پر نہ صرف دلّی کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی بلکہ برصغیر میں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ محض اتنی ہی سی بات نہیں ہوئی کہ ہر طرف سے ان کی شکستہ پائی اور ناطقہ بندی کا بھیانک ماحول بن گیا بلکہ ایسی پیچیدگیاں رونما ہونا شروع ہوگئیں کہ لگتا تھا کہ پوری قوم یا تو فنا کے گھاٹ اتر جائے گی یا اپنے دین و ایمان سے برگشتہ و منحرف ہوکر اغیار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجائے گی۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے ان کے استحصال کے لئے کون سے جتن نہ کئے اور کون سے دیرینہ ارمان پورے نہ کئے۔ سیاسی سماجی معاشی مذہبی تہذیبی اور علمی سطحوں پر استحصال کے بے شمار پُر پیچ اور پُر فریب ہتھکنڈوں کو استعمال کیا گیا اور پورے شد و مد کے ساتھ ان کے خلاف آزمایا گیا۔ الغرض ان حوادث و واقعات کے نتیجے میں ایک طرف مسلمانوں کی حکومت و امارت کا تختہ الٹ گیا اور ان کی آٹھ سو سالہ موروثی دولت و حشمت تاخت و تاراج ہوگئی تو دوسری طرف دین و ایمان اور فکر و نظر پر بھی یورش و یلغار ہوئی۔ عقائد بگڑنے لگے، تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا جنازہ اٹھنے لگا۔

۲- زوالِ سلطنت کے اثرات زوالِ سلطنت کہنے کو تو فقط دو لفظ ہیں لیکن یہ کسی قوم اور ملک کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں۔ سلطنت کا استحکام عوام و خواص کے حق میں ایک عظیم نعمت ہوتا ہے جو انھیں اپنی مقصدی اور تعمیری صلاحیتوں کو کسی مخصوص نقطہ پر مرکوز کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ وہ سلطنت کی حدود میں امن عامہ کو استقرار عطا کرنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ سلطنت کی کمزوری طرح طرح کے فتنوں کے ابھار کا نقطۂ عروج بن جاتی ہے اور عوام و خواص کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثرات بد سے محفوظ و مامون نہیں رہ پاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے چند برسوں کے اندر مغلیہ سلطنت اس طرح انتشار و افتراق کا

شکار ہوئی اور عیش کوشیوں و سہل پسندیوں کی لذتوں میں گرفتار ہو کر ایسے جمود و تعطل کا مظاہر بنی جو زندگی کے ہر شعبے پر عموماً اور مسلمانوں کی زندگی کی تمام سطحوں پر خصوصاً دور رس نتائج کا محرک ثابت ہوئی۔ کبھی وہ وقت تھا کہ شاہی دربار میں ممالک محروسہ سے آئے ہوئے خراج کے انبار کو دیکھ کر غیر ملکی سفراء کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور سلطنت کے مقبوضات سے آئے ہوئے انواع و اقسام کے نوادر کی تفصیل بیان کرنے میں مورخین صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالتے تھے۔ برنیئر دربار شاہ جہانی میں پیش آمدہ سیم و زر، لعل و جواہر اور دیگر عجائب و غرائب کی ایسی لمبی چوڑی اور بھاری بھرکم تفصیل بیان کرتا ہے کہ عقل انسانی حیرت زدہ رہ جاتی ہے [8] لیکن اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جس طرح لال قلعہ آہوں اور سسکیوں کا مسکن بن گیا اس کو پڑھکر اور سن کر آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔ جاٹوں، مرہٹوں، سکھوں اور روہیلوں نے دلی اور اس کے اطراف میں لوٹ مچا رکھی تھی۔ 1788 میں غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لیں اور اس کو سخت ذلیل کیا نیز اپنے پشتینی بغض و عناد کا بدترین ثبوت پیش کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سلطنت و حکومت نام کی کوئی چیز رہ ہی نہیں گئی ہے [9] صاحبان علم و فن ہراساں و سرگرداں لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدرآباد کی طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ میر تقی میر جیسا صاحب فن اپنی خانماں بربادی اور وطن کی پریشاں حالی کا ذکر ان الفاظ میں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

جس دلی پر کبھی میر نے یوں فخر کیا تھا: ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں + دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں یا دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے + جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی اب اسی کی بربادی پر وہ اس طرح ماتم کرتے ہیں: اب خراب ہوا جہاں آباد + ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا یا اب شہر ہر طرف سے ویران ہو گیا ہے + پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابہ یا خس و خاک خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں + واں ہم نے انہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں [10]

---

[8] لال قلعہ دہلی میں روشنی اور آواز کی مدد سے دکھایا جانے والا پروگرام LIGHT AND SOUND

[9] برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت —— ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ص ۲۰۰

[10] اقتباس از مقدمہ مرزا مظہر جان جاناں —— عبدالرزاق قریشی ص ۱۰

جس بلاد لگاراں کو ضیاء الدین برنی نے رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ اور موازی بیت المقدس کہا تھا[11]
اب اس کی بربادی کا مرثیہ مرزا سودا اس طرح پڑھتے ہیں :

باغ دلّی میں جو اک روز ہوا میرا گذر + نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل نے بار پڑے سوکھی پڑی ہیں لاشیں + خاک اڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا + اشک شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد + پشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر + عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدم سرد و لبصد حسرت و صد سوز جگر + دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالہ و زار

مرزا سودا کے استاد شاہ حاتم کا شہر آشوب بھی اس دور کے سیاسی و معاشرتی فساد و انتشار کا عمدہ آئینہ ہے :

تو کھول چشم کوں اور دیکھ قدرت حق یار + جہاں کہ باغ میں یکساں ہے اب خزاں و بہار نہ کھو تو عمر کو غفلت میں ٹک تو ہو ہشیار + کہ دو زمانہ ہی کا ہے تخت کج رفتار[13]

دکن سے دلّی تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر اور پنجاب سے افغانستان تک سکھوں کے قبضہ میں جن کی تاخت و دستبرد سے ہندوستان کا شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہ تھا نیز دلّی اور اطراف دلّی مرہٹوں اور سکھوں کی غارت گری کا نشانہ بنتے تھے۔ ابدالی کی واپسی کے بعد مریض سلطنت کا حال ابتر ہو گیا تھا۔ مرہٹوں کا زور بڑی حد تک ختم ہوا لیکن ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی روز بروز ابھرنی شروع ہوئی۔ یہ نہایت منظم ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی۔ اس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم کر لیا کہ 1803 میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو گئیں اور اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہ عالم ثانی انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔ بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوئی۔ یہ نتیجہ تھا اس بے حسی، بے عملی اور خود فراموشی کا جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے :

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

---

[11] + [12] مقدمہ مرزا مظہر جان جاناں — عبدالرزاق قریشی ص ۱۰ + ۱۱

[13] دیباچہ دیوان زادہ شاہ حاتم — ڈاکٹر سراج الحق قریشی ص ۶ اکادمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی ۱۹۹۲ء

سیاسی شورش، معاشرتی انحطاط اور اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے عام اخلاقی معیار بے حد پست ہو گیا تھا۔ تساہل پسندی، عیش کوشی، شراب نوشی اور طوائفوں کی گرم بازاری عام تھی۔ نیک طبع لوگ جن میں اخلاقی قدروں کا احساس باقی تھا تصوف کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے تھے لیکن سیاسی بے چینی، معاشی ابتری اور تہذیبی انحطاط نے عام طور پر لوگوں کو اس قدر مایوس اور توہم پرست بنا دیا تھا کہ وہ مذہب و تصوف کے نام سے طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہ کن رجحانات میں مبتلا ہو گئے تھے، ایرانی اثرات کی وجہ سے شیعیت کا زور تھا اور شیعی رسومات کثرت سے سنیوں میں رائج تھیں۔ اوہام پرستی اور رسم و رواج کی پابندی میں ہندووانی اثرات کا بھی بڑا دخل تھا۔[14] ان حالات کی اصلاح کے لئے دہلی کے ایک علمی خاندان کے ایک ممتاز فرد شاہ ولی اللہؒ اٹھے۔ شاہ صاحب نے اپنے تاریک دور میں جو روشنی کی وہ حقیقت میں اس شمع کا پرتو تھی جو تقریباً دو صدی پہلے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ نے اکبر و جہانگیر کے عہد میں روشن کی تھی اور جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو لادینی کی تاریکی میں گمراہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اسلامی ہند بڑی حد تک عربی سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت محض خیر و برکت کی خاطر کی جاتی تھی، اس کے معنی و روح سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لئے ان کا پہلا اصلاحی قدم قرآن مجید کے فارسی ترجمے کی شکل میں اٹھا۔ اس کے بعد انھوں نے موطا امام مالک کی فارسی شرح لکھی تاکہ مسلمان صحیح احادیث سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ ایک رسالہ عقد الجید لکھا جس میں اجتہاد کی ضروریات اور احکام بتائے۔ لیکن شاہ صاحب کی عظمت و تقدس اور علمی فضل و کمال کی عمارت کا سب سے عظیم ستون ان کی لازوال تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ عقائد و خیالات کی اصلاح کی بھی کوشش کی۔ وہ اسلامی معاشرے کو ہندوانہ رسوم اور ایرانی تکلفات و خرافات سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلمانوں کو معاشرتی حیثیت سے عہد رسالت کی سادہ و بے تکلف زندگی تک پہونچانے کی سعی کی۔

شاہ صاحب کے وصال کے بعد ان کے لائق فرزندوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی نے اور ان حضرات کی لائق نسلی و روحانی اولادوں نے ان کے اہم اور مقدس کام کو جاری رکھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ شاہ صاحب اپنی اصلاحی کوششوں میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوئے لیکن بقول شیخ محمد اکرم:

اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو . . . . . مغلوں کا تخت و تاج تو بہہ گیا لیکن تسبیح و سجادہ سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ دینی انحطاط شروع نہیں ہوا۔[15] شاہ صاحب کی اس اصلاحی کوشش میں علمائے فرنگی محل کا بھی حصہ ہے جنھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے صحیح اسلامی تعلیم کی اشاعت

کی کوشش کی ۔ ان کے علاوہ اس عہد کے بعض مشائخ اور صوفیاء نے بھی حصہ لیا ۔ اوّل تو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا زمانہ ہی کیا کم پُرآشوب ہے جس کے بیان سے قلم عاجز ہے کہ ان کے نامور صاحب زادگان کا وقت آتے آتے تو سیاسی اُفق اسقدر مکدّر ہو گیا کہ علمائے حق اپنے بساطِ درس و تدریس پر کھنچ پڑے اور اپنے گوشوں اور زاویوں سے قدم باہر نکالنے پر مجبور ہو گئے ۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں :

یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی ۔ اس بنا پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (1740 تا 1820) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے انھوں نے صاف لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا ۔ چنانچہ بعض کتب فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں : " اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے بلکہ نصاریٰ کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے ...... ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ، عیدین، اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو بھلے نہ کریں مگر ان احکام کی اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل ہیچ اور ضائع ہیں کیونکہ مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں ....

غرض کہ جب حدیثوں اور صحابہ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب کا حکم رکھتا ہے ۔ " [16] یہ فتویٰ سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد کا محرک ثابت ہوا جس کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور اسے صحیح معنوں میں دارالاسلام بنانا تھا ۔ ان کی شہادت کے بعد تحریکِ مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ علمائے صادق پور کی تحریک کے نام سے جاری و ساری رہا ۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید جیسے سرفروشوں کے پاس نازک اور سنگین حالات کے وقت بھی محاذِ جنگ سے نکل بھاگنے کے راستے اور وسائل موجود تھے اور حریت پسندوں کو از سر نو منظم کرنے کا جواز بھی موجود تھا ۔ اس لئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں بابو کنور سنگھ اور رانی لکشمی بائی نے اس حکمت عملی کو کئی بار کامیابی کے ساتھ اپنایا تھا مثلاً انگریزوں کے ساتھ

کئی بار محاذ آرائی کے وقت نازک حالات میں جھانسی کی رانی اپنے چند قابل اعتماد رفیقوں کے ساتھ
چھلاوے کی مانند اس طرح انگریزی صفوں کو چیرتی ہوئی اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی نکل جاتی
تھی کہ دشمن دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا تھا۔ لیکن ٹیپو سلطان نے اپنے نقطۂ نظر کو ایک جملے میں ادا کرکے
حریت پسندوں کی جامع اور مکمل تاریخ لکھ دی "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"[۱۷]
اس مردِ مجاہد نے ثابت کر دیا: شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن + نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
سید احمد شہیدؒ نے بھی نازک حالات میں چاہا کہ خود تو نہیں لیکن اپنے دستِ راست اسمٰعیل شہیدؒ اور
کچھ معتمد رفقاء کو میدانِ جنگ سے محفوظ مقام پر منتقل کردیں تاکہ اس مشن کو آگے جاری رکھا جاسکے اور
از سرِ نو منظم ہو کر جنگ لڑی جائے لیکن اسمٰعیل شہیدؒ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ جس جذبہ کو لیکر دلّی
سے بالاکوٹ تک آپ کی رکاب میں دوڑتا آیا ہوں اس سے محروم نہ فرمائیں (یعنی جذبۂ شہادت)
وادیٔ کاغان کے سادات سید صاحب کی حمایت کے لئے تیار بیٹھے تھے لیکن انھوں نے اور ان کے رفقاء
نے فرار پر فنا کو اور زندگی پر موت کو ترجیح دی۔[۱۸]
سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن + بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز + اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
آج بھی حضرت سید احمد شہیدؒ کا یہ تاریخی جملہ حریت پسندوں کے کانوں میں گونج رہا ہے جو انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ
کے فرانسیسی کمانڈر الجیف کو لکھا تھا "تمہیں شراب اور عورت سے جتنی محبت ہے اس سے زیادہ ہمیں موت سے محبت ہے"[۱۹]

---

[۱۴] + [۱۵] مقدمہ مرزا مظہر جان جاناں ــــ عبدالرزاق قریشی ص ۱۳+۱۵
[۱۶] برصغیر کی شرعی حیثیت ــــ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری ص ۱۱۱
[۱۷] سلطان ٹیپو ــــ سراج الدین ص ۱۳۵
[۱۸] + [۱۹] سید احمد شہید ــــ طلحہ سلطان ص ۶۵
موخر الذکر تاریخی جملہ حضرت خالد بن ولیدؓ کا ہے جو انھوں نے قیصرِ روم کے سپہ سالار کو لکھا تھا۔

الغرض زوال سلطنت کے اثرات کا اندازہ مندرجہ ذیل بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :

• اس وقت خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس شعر سے ہوگا :[20]

کَاَنَّ نجوماً اومضت فی الغیاہب عیون الافاعی او رؤس العقارب (جو ستارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے ڈنک)

• شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں " از سلطنت بجز نامی باقی نماند "[21] (سلطنت تو اب برائے نام ہی باقی رہ گئی ہے)

• شاہ ولی اللہ صاحب ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں " اختلال حال شہر کہ روز فتنۂ تازہ گل می کند و ترسی دیگر در خواطر مردم می نشیند "[22] (شہر کی خرابی کا یہ عالم ہے کہ ہر روز ایک نیا فتنہ ابھرتا ہے جبکہ مزید فتنوں کا ڈر بھی پہلے سے لوگوں کے دل میں سمایا رہتا ہے)

• مرزا مظہر جان جاناں اپنے کسی مرید کو لکھتے ہیں " از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند "[23] (فتنے ہر طرف سے دہلی ہی کی جانب بڑھے چلے آتے ہیں)

• پروفیسر خلیق احمد نظامی اس دردناک منظر کو یوں بیان کرتے ہیں " دہلی والوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی ۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے ذریعے ان مصائب و آلام ناگفتنی سے رستگاری کی سوچنے لگے تھے "[24]

الغرض اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بدامنی اور شورش کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھیں ۔

۳ - غدر کے نتائج

1857 میں جو واقعات رونما ہوئے اس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے موسوم کیا اور ہندوستانیوں نے اسے جنگ آزادی کا نام دیا ۔ مجاہدین آزادی نے انگریزوں کی مخالفت بڑے شد و مد سے کی اور ہنگامہ خیزی کا یہ سلسلہ تقریباً سال بھر یعنی 1858 تک قائم رہا لیکن چونکہ مجاہدین کی مختلف

---

[20] + [21] + [22] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — پروفیسر خلیق احمد نظامی ماخوذ از مقدمہ مرزا مظہر جانجاناں ص ۵ + ۹

[23] مکتوبات مرزا مظہر جانجاناں مکتوب پنجاہ و چہارم ص ۵۲ ماخوذ از مقدمہ مرزا مظہر جانجاناں ص ۹

[24] مشائخ چشت — پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۳۵

جماعتوں کے درمیان صحیح رابطہ اور متحدہ فوجی محاذ قائم نہیں تھا اس لئے اس تحریک کو انگریزوں نے بری طرح کچل دیا۔ باوجودیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کو اس میں دخل تھا اور دونوں ہی قوموں نے ایک دوسرے کے ساتھ شانہ سے شانہ ملاکر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن ناکامی کے بعد سارا نزلہ مسلمانوں پر گرا، اس لئے کہ انگریزوں کے براہ راست مد مقابل وہی تھے اور انگریزوں نے انھیں سے اقتدار اور حکومت چھینی تھی، اس لئے اس تمام عرصہ میں اور آئندہ بھی ایک طویل مدت تک وہ انگریزوں کی آنکھوں میں کانٹے کی مانند کھٹکتے رہے اور ان کے ظالمانہ عتاب کا شکار رہے۔ انگریزوں کی نگاہوں میں مشکوک ومعتوب ہونے کے سبب سب سے زیادہ وہی ان کی قہر سامانیوں کا نشانہ بنے اور سب سے زیادہ جان ومال اور عزت آبرو کا نقصان اور تباہی وبربادی بھی انھیں کو اٹھانی پڑی۔ بات بات پر ان کو قتل کیا گیا اور سر بازار پھانسیاں دیدی گئیں۔ حالات اس درجہ مخدوش تھے کہ اشاروں اور کنایوں میں بات کرنے پر موت کی سزا دیدی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے مال واملاک ضبط ہی نہیں کئے گئے بلکہ تہس نہس کر دئے گئے اور انھیں زندگی کی تمام تر سہولتوں اور خوشیوں سے محروم کردینے کا ایسا بھیانک سلسلہ قائم کیا گیا جس کے روح فرسا واقعات کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مولانا قاسم نانوتی ان دردناک حالات کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

یہ وہ معرکہ تھا جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہوگئی تھی اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی اور کارخانۂ اسلام تہہ وبالا ہوگیا تھا۔ ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا، ہر مومن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی، نہ میں تجھ نہ تجھ میں کا حال تھا یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے اور بعض بعض جو پنجۂ اجل سے بچے اس ملک سے ہجرت فرماگئے۔ ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدمۂ عظیم واقع ہوا تھا جیسا

رسول مقبول ﷺ کی وفات شریف پر کل اسلام پر ۔ مسلمانوں کی قلت ، کفر کی شدت ، کفار کی کثرت ، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب دین نسیاً منسیا ہو جائے گا۔[۲۵]

جب مسلمان حکمراں عیاشیوں اور بدکرداریوں میں مبتلا ہو گئے اور ان کی کوتاہیوں ، بدعملیوں ، بد دیانتیوں ، عیش پرستیوں اور حرام کاریوں نے انھیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ اب وہ تاج و تخت کے مالک بن کر ملک پر حکومت کر سکیں تو خدا تعالیٰ نے ہزار برس حکومت کرنے والے مسلمان فرماں رواؤں سے چالیس کروڑ انسانوں کے وسیع ترین ملک کی سلطنت چھین لی ۔ خود مختار بادشاہوں کو ملک بدر اور اسیر ہونا پڑا اور اس انگریز نے ان کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا جو ایک روز انھیں کی منت سماجت کرکے ان کے ملک میں تجارت کرنے آیا تھا ۔ نتیجے کے طور پر اپنے معاصرین اور آئندہ نسلوں کے راستے میں اور قوم و ملت کے حق میں بیش از بیش مصائب کے پہاڑ کھڑے کر گئے ، بے شمار مسائل کا انبار لگا کر گئے ، اپنی قوم کو اقوام عالم کے مقابلے میں سیکڑوں برس پیچھے پھینک کر گئے بلکہ جابر و قاہر قوموں کو اپنی قوم کے سر پر مسلط کرکے گئے ۔ جہالت ، بے ہنری ، معاشی بدحالی ، اخلاقی پستی اور بے حسی و بے عملی کے خطرناک منفی عناصر کو جنم دے کر گئے ۔ تعلیم و تربیت ، علم و ہنر ، اعمال و کردار ، دولت و ثروت ، سیاست و معیشت ، مذہب و اخلاق ہر میدان میں اور ہر سطح پر پیچیدگیوں کا لامتناہی سلسلہ چھوڑ گئے جن کی گتھیوں کو ایک طویل عرصہ سے سلجھایا نہ جا سکا ۔

---

[۲۵] حیات قاسمی جلد دوم ـــــ مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۹۸

② اس دور کی تعلیمی تحریکات

برصغیر کے اس مختصر تاریخی اور سیاسی جائزہ اور تحریک آزادی 1857 کے بعد رونما ہونے والے تعلیمی مراحل و مدارج پر نظر کرتے ہیں تاکہ معارف کے اجراء اور اس کے مقاصد کو سمجھنے میں برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنی و فکری سفر کے نشانات زیادہ واضح شکل میں عیاں و نمایاں ہو سکیں، معارف کے مضامین اور مضمون نگاروں کی نگارشات کی قدر و قیمت کے تعین میں یہ جائزہ ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔

اجمالی جائزہ مسلمان دانشوروں نے اس دور میں اپنے علم و فن کی بقا اور اپنے فکری و نظریاتی سرمایوں کے تحفظ کے لئے جن تحریکات کو اختیار کیا ان میں مندرجہ ذیل چار طرح کے رجحانات یا مکتبۂ فکر و نظر (SCHOOL OF THOUGHTS) نظر آتے ہیں:

۱۔ پہلا رجحان یا پہلا مکتبۂ فکر و نظر قدامت پسند روایات کے حامل اشخاص کا ہے جنھوں نے انگریزوں کی تعلیمی پالیسیوں سے مکمل طور پر اختلاف کرتے ہوئے پورے طور پر اس کے ساتھ قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک کی نمائندگی اور قیادت کرنے والے ادارہ کا نام دارالعلوم دیوبند ہے جو 1867 میں قائم ہوا اور جس کے بانی مولانا قاسم نانوتوی تھے۔ یہ ادارہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی احیاء اسلامی کی تحریک کا علم بردار ہے۔

۲۔ دوسرا رجحان جدت پسندوں اور نئی تہذیب کے قدردانوں بالخصوص ان انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے ذریعے معرض وجود میں آیا جن میں سے بیشتر یا تو سرکاری عہدوں پر فائز رہے یا انھیں انگریزوں کا منظور نظر بننے اور انگریزی تہذیب و تمدن کا شیدائی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس رجحان کے حاملین کا خیال تھا کہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کی جزوی ترمیمات کے ساتھ پورے طور پر قبول کر لینے اور اپنا لینے میں ہی قومی مستقبل کا تحفظ مضمر ہے۔ اس رجحان کی وکالت خصوصی طور پر MOHAMMADAN ANGLO ORIENTAL COLLEGE (M.A.O College) کی جانب سے ہوئی جس کے بانی سر سید احمد خان تھے اور جو ابتداء میں ایک تعلیمی مدرسہ کی صورت میں 24 مئی 1875 کو قائم کیا گیا اور 1921 میں ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY (A.M.U) میں تبدیل ہوا۔

۳۔ تیسرا رجحان یا تیسرا مکتبہ فکر ونظر علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی فاصلہ پر قائم ہوا اور مذکورہ بالا دونوں تحریکوں سے بے اطمینانی اور بددلی کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ دونوں تحریکوں کی خوبیوں کو قبول کرنے اور دونوں اداروں کے نقائص کو دور کرنے کے مقصد کو لیکر اس رجحان نے پیش رفت حاصل کی۔ اس مکتبہ فکر کی نمائندگی ندوہ کے نام سے جانے والے ندوۃ العلماء لکھنو نے قبول کی جو 1894 میں قائم ہوا۔

۴۔ چوتھا رجحان یا چوتھا مکتبہ فکر ونظر اس وقت پیدا ہوا جب پہلی عالمی جنگ کے نتائج نے مسلمانوں کو متاثر کیا اور دانشوروں کے ایک طبقہ نے بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی قومی رنگ میں رنگنے کا فیصلہ کیا اور مذکورہ بالا تینوں تحریکات کو قومی ضروریات کی حصولیابی میں ناکافی محسوس کیا۔ اس مکتبہ فکر کا نقیب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ثابت ہوا جو 1920 میں قائم ہوا۔ اس تحریک کی قیادت مولانا محمد علی جوہر اور بنا شیخ الهند مولانا محمود الحسن نے ڈالی۔

ذیل میں ان چاروں مکتبہ ہائے فکر ونظر کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے :

دارالعلوم دیوبند

—— دیوبند ایک مدرسہ کی صورت میں ابھر کر آیا لیکن بہت کم عرصہ میں ایک مستحکم اور قبول عام تحریک کی حیثیت اختیار کر گیا جس کی تقلید میں دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے مدارس مثلاً مظاہر العلوم سہارن پور، مدرسہ فیض عام کانپور اور مدرسہ اشرف مراد آباد قائم ہوئے۔

—— دیوبند کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد دین اسلام اور ثقافت اسلامی کا تحفظ اور اشاعت رہی۔

مختلف دینی خدمات مثلاً دارالافتاء کا قیام جس نے شرعی معاملات میں بڑے پیمانے پر نہایت ذمہ داری کے ساتھ رہنمائی کی۔

—— مختلف ادوار میں جب جیسی ضرورت پڑی عیسائی مشنریوں، آریہ سماجیوں اور اسلام مخالف عناصر کے لٹریچر کا جواب دیا۔

—— یہاں کے علماء وفضلاء مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ کشمیری اور قاری محمد طیب نے بلند پایہ علمی خدمات انجام دیں۔

—— دیوبند نے اپنے اساتذہ اور طلباء کو سرفروشی کا سبق سکھایا۔ مختلف ادوار میں استعماری طاقتوں کے خلاف انقلابیوں کے ایک اہم مرکز اور قابل قدر محاذ کے طور پر استعمال ہوتا رہا مثلاً شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ریشمی رومال کی مشہور تحریک یہیں سے ابھری۔ تحریک خلافت، عدم تعاون کی تحریک، ترک موالات کی تحریک

کانگریس کی تحریک، پاکستان کی تحریک وغیرہ کو یہاں کے اساتذہ اور طلباء کی بھرپور تائید حاصل رہی۔ جمیعۃ العلماء اور جمیعۃ الانصار جیسی تحریکیں بھی یہیں کے اساتذہ اور طلباء کے ذریعے تشکیل پائیں۔

—— دیوبند کی تعلیم عوامی زندگی سے مربوط اور ہم آہنگ رہی۔ یہاں کا ماحول سادگی اور جفاکاری کی بہترین مثال رہا۔

—— دیوبند کے اکابر نے شروع سے اس بات کو اپنا نصب العین بنالیا کہ اس مقدس دینی ادارے پر حکومت وقت کا مکروہ سایہ بھی نہ پڑے اور مفاد پرست عناصر کے دائرہ اثر سے کلّی طور پر اس کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ بات اس ادارے کے ذمہ داروں کے تقویٰ و طہارت، صبر و توکل اور بے نفسی و بے تعلقی پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں کے اکابر نے بے سروسامانی کو اختیار کیا لیکن غلط ذرائع سے مدد و امداد اور تعاون کی پیشکش کو ہرگز قبول نہیں کیا۔

—— اسلام کے جمہوری اور شورائی روایت کو اس ادارے نے سختی سے پکڑنے اور نبھانے کی کوشش کی۔ اس ادارہ کا کنٹرول فرد واحد یا خاندان واحد کے انتظام میں نہ جاکر براہ راست مجلس شوریٰ کے زیر نگرانی رہتا ہے جس کی ہدایات اور مشوروں کے مطابق ہی مہتمم مدرسہ امور کی انجام دہی اور فیصلوں کے نفاذ پر قدرت پا سکتا ہے۔

ایم اے او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دیوبند کی تعلیمی تحریک اگر سامراج سے مقابلے اور مقاومت کے رجحان کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہے تو اس کے بالمقابل علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مصالحت و مفاہمت کی مظہر ہے۔

1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ انگریز ان کے پرانے تعلیمی نظام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف عیسائی مشنریاں بڑی تیزی کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں منہمک تھیں اور مسلمانوں کی دینی بنیادوں کو منہدم کرنے میں مصروف تھیں۔ جو نیا تعلیمی نظام انگریزوں کی طرف سے قائم کیا گیا تھا اور جسے تیزی کے ساتھ فروغ دیا جارہا تھا وہ مذہبی تعلیم اور دینی روح سے یکسر عاری تھا اور ہندوستان کی نئی نسلوں کو لادینیت اور مغربیت کے رنگ میں رنگ رہا تھا۔

پھر یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ اس نئی تعلیم سے دوسرے برادران وطن بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور من حیث القوم انگریزوں کا منظور نظر بن کر اپنے ہزار سالہ اقتدار سے محرومی کا حساب چکانا چاہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکات ابھریں اور انھوں نے ہندوؤں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بھی مسلمانوں پر ایک بالاتر قوم کی حیثیت سے غالب ہوسکتے ہیں۔ "آریہ سماج" نے کھل کر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر حملے کئے اور ہندوستان کی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ہندوؤں نے "شدھی" کی تحریک چلائی۔ اس زمانہ میں

ہندو مسلم مخالفت بلکہ منافرت کا بیج بویا گیا اور یہ بات بڑی حد تک واضح ہوگئی کہ ان دونوں قوموں کو جداگانہ طور پر اپنی سیاسی قسمت بنانا ہوگی۔ [۲۶]

مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی ظالمانہ اور منتقمانہ تھی۔ وہ صرف ان کے نظام تعلیم ہی کو ختم نہیں کر رہے تھے بلکہ پورے تہذیب و تمدن کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ سیاسی معاشرتی اور اخلاقی حیثیت سے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دیں۔ روزگار کے تمام دروازے مسلمانوں کے لئے بند کر دئے گئے تھے۔ ان کے پرانے نظام تعلیم کا ہر رابطہ نئے انتظامی اور معاشرتی نظام سے منقطع کر دیا گیا تھا اور روزگار کی کنجیاں نئی تعلیم کو دیدی گئی تھی۔ [۲۷] ان حالات میں ایک راستہ تو ان لوگوں نے نکالا جنھوں نے نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی اپنے ماضی کے نظام سے رشتہ کا ٹنا گوارا نہ کیا لیکن کچھ دوسرے حضرات نے صورت پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ مسلمان اپنے آپ کو لڑ کر نہیں بلکہ ان سے مفاہمت کر کے بچا سکتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے: چونکہ مسلمانوں کو ایک نہیں دو دشمنوں سے نپٹنا ہے اس لئے یہ لڑائی بیک وقت نہیں لڑی جا سکتی۔ نیز 1857 کے معرکہ کے بعد مسلمانوں میں یہ دم خم بھی نہیں ہے کہ وہ اس وقت کی باقی ماندہ قوت کے بل پر آنے والی طویل مدت تک کوئی لڑائی لڑ سکیں بلکہ ان حالات میں لڑائی کے طرز پر سوچنا مسلمانوں کے لئے شدید خطرات کا حامل ہے۔ اُن کے لئے سیدھا راستہ بس یہ ہے کہ وہ انگریزوں سے وفاداری کا تعلق قائم کریں، انگریزی تعلیم حاصل کریں اور ملازمتوں میں اپنے لئے گنجائش پیدا کریں۔ نئے حالات میں وہ اپنے آپ کو بدلے بغیر چل نہیں سکتے۔ گویا چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی ——— اس نئے رجحان کے سب سے بڑے علم بردار سر سید احمد خاں تھے۔ سرسید کا تعلق بالائی متوسط طبقہ سے تھا۔ انھوں نے اپنی ساری عمر برطانیہ کی ملازمت میں گزاری لیکن اس زمانہ میں بھی وہ بڑے خلوص اور ہمدردانہ جذبہ کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے رہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو جو خواہ کتنے ہی دبے الفاظ اور خوشامدانہ انداز میں کیوں نہ تھا پیش کرتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'اسباب بغاوت ہند' نے خاصا نام پیدا کیا اور دوسری کتاب 'وفادار ہندوستانی مسلمان' زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ سیاسی حیثیت سے سرسید احمد خاں اس بات کے قائل تھے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کامل وفاداری کی روش اختیار کرنا چاہئے اور جہاد و مقابلے کا ہر تصور ختم کر دینا چاہئے۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز وہ صرف نئی تعلیم ہی میں نہیں نئی تہذیب

کے قبول کرنے میں مضمر پاتے تھے ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دونوں کاموں کو انجام دینے کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ معاشرتی اور مذہبی میدانوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں ۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ سرسید نے علی گڑھ میں جس تعلیمی نظام کا آغاز کیا اس کی کیا خصوصیات تھیں :

—— علی گڑھ نے انگریزوں کے تعلیمی نظام اور اس کی ہیئت کو قبول کرکے اس کے اندر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہاں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق نیا تعلیمی نظام تیار کیا جائے بلکہ یہ سوچا گیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام میں مسلمانوں کے لئے پاؤں ٹکانے کی جگہ فراہم کرلی جائے ۔ یہ چیز علی گڑھ کے مزاج کا ایک جزو بن گئی اور علی گڑھ نے جو نیا ذہن تیار کیا وہ اتباع اور مصالحت کے انھیں رجحانات کا آئینہ دار ہے ۔ اس میں ایک طرف مغربی تعلیم کو بعینہ لے لیا گیا اور اس تعلیم کے مزاج کو بھی اختیار کرلیا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں مسلمانیت کا اضافہ کرنے کے لئے دینیات کا ایک PERIOD رکھا گیا اور HOSTEL میں نماز روزہ اور دوسرے شعائر اسلامی کے لئے سہولتیں دی گئیں ۔ متضاد عناصر کے اس اجتماع کو خود اس ادارہ کا اولین نام بالکل صحیح طور پر پیش کرتا ہے یعنی MOHAMMADAN ANGLO ORIENTAL COLLEGE [۲۸]

—— یہ کالج رہائشی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس حیثیت سے اس کا یہ اثر ہوا کہ اپنے طلباء کا ایک مخصوص مزاج بن سکا ۔

—— یہ تعلیمی ادارہ مسلمانوں میں عام تعلیم UNIVERSAL EDUCATION پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ متمول طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا ۔ تعلیم کے لئے فیس کا طریقہ رائج کیا گیا اور رہائشی ہونے کی وجہ سے صرف وہی لوگ اپنے بچوں کو بھیج سکتے تھے جو تعلیمی مصارف کا گراں بار اٹھا سکتے تھے ۔ اس حیثیت سے یہ مسلمانوں کے اب تک کے نظام تعلیم سے ایک اہم انحراف بھی تھا ۔

—— اس ادارہ میں اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ رکھے جائیں جس کا اصل مقصد تو شاید انگریزوں کو اپنی وفاداری اور غیر منفعت رسانی کا ثبوت دینا تھا لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اساتذہ کی گرفت کالج پر مضبوط تر ہوتی گئی اور مغربیت کی رو طلباء میں تیزی سے سرایت کرتی چلی گئی ۔

سرسید کی بڑی خواہش تھی کہ اس ادارے کو ایک یونیورسٹی بنائیں لیکن اپنی زندگی میں وہ یہ کام نہ کرسکے ۔ ان کی وفات کے وقت کالج مالی بحران سے دوچار تھا ۔ پچاس ہزار کا قرض تھا ۔ طلباء کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور کشتی ہچکولے کھاتی نظر آتی تھی لیکن نواب محسن الملک مہدی علی خان نے اس ادارے کو بڑی قربانیوں اور جاں فشانیوں سے چلایا اور اس میں دوبارہ زندگی کی روح پھونک دی ۔

اس کے بعد نواب وقار الملک نے باگ ڈور سنبھالی اور بالآخر 1921 میں M.A.O COLLEGE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY (A.M.U) میں تبدیل ہوا۔ علی گڑھ کی داستان میں ہند و پاک کے مسلمانوں کی سو سالہ تاریخ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس ایک ادارے نے جو کچھ کیا اور جو خدمات انجام دیں اسے بلاشبہ اپنے مقصد میں انقلابی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ ایک نئے انداز کی تعلیمی تحریک کا نقیب ثابت ہوا اور اس کے زیر اثر انھیں خطوط پر مسلمانوں کے متعدد تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ بلاشبہ علی گڑھ نے ادبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی پر نہایت اہم اثرات ڈالے۔

اب ہم علی گڑھ کے تاریخی رول کے تنقیدی جائزہ کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ مدح و قدح کا یہ عمل میزان الانصاف پر پورا اتر سکے۔

——— اگر مسلمانوں کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض ایک قوم کی حیثیت سے لیا جائے تو علی گڑھ ان کے جدید دور کا سب سے بڑا محسن ہے۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو اس ہاری ہوئی فوج کے مانند سمجھا جس کے لئے سب سے صحیح حکمت عملی محض اس کو بچا لینا ہے خواہ اس کو بچانے کے لئے عزت و غیرت کی کتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اس حیثیت سے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے تعلقات انگریزوں سے استوار کرائے، بے اعتمادی کی فضا دور کی، انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کیں، کچھ سیاسی رشوت دی، کچھ دم خم مسلمانوں کے ختم کئے، ان میں تسلیم کی خو ڈالی اور اس طرح جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے کم از کم تھوڑی دور تک ہی سہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔

——— معاشی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے حصول اور روزگار کے دوسرے مواقع کے حصول میں علی گڑھ کا بڑا حصہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی کے دروازے بالکل بند ہو گئے تھے وہ اس نئی تعلیم کی وجہ سے پھر ایک حد تک کھل گئے اور اس نے مسلمانوں کو دوبارہ قدم جمانے کا موقع دیا۔

——— علی گڑھ ایک نئی ادبی تحریک کا بانی ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت آسان اور عام فہم اسلوب بیان ہے۔ اردو ادب اور صحافت کا نیا آہنگ بڑی حد تک علی گڑھ کا رہین منت ہے اور یہ اس کی عظیم ترین خدمات میں سے ایک ہے۔

——— علی گڑھ نے بیسویں صدی میں اور خصوصیت سے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ایک نیا سیاسی کردار بھی ادا کیا اور وہ یہ تھا کہ علی گڑھ اس کے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کی خواہشات کے علی الرغم مسلمانوں کی نئی سیاسی بیداری کا مرکز بن گیا۔ اس کا سب سے دلچسپ تاریخی پہلو یہ ہے کہ آخری دور میں مسلم قومیت اور دو قومی نظریہ کی تحریک کا گہوارہ علی گڑھ ہی بنا۔ اس طرح جو ادارہ انگریزوں سے قرب و مفاہمت کے جذبے سے قائم ہوا تھا وہی انگریزی اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔

——— مسلمانوں کی گزشتہ اسّی برس کی نئی قیادت بڑی حد تک علی گڑھ ہی نے فراہم کی۔ [29]

ندوۃ العلماء لکھنو

ندوۃ العلماء لکھنو قدیم نظام تعلیم کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے

کی ایک کوشش کا نام ہے ۔ چنانچہ نئی اصلاحات کو بروئے کار لانے کی غرض سے 1894ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا جس کے بانیوں میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی وغیرہ شامل تھے ۔ اس علمی مرکز کی اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ 'الندوہ' جاری کیا گیا ۔

——— ندوہ نے قدیم نظامِ تعلیم کی اصلاح کرکے اور کچھ جدید مضامین کو شامل کرکے ایک نیا نصاب تشکیل دیا جس میں قدیم خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور جدید ضرورتوں کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی گئی۔

——— قدیم اسلامی درسگاہوں کی روایات کو زندہ کرکے اقامتی زندگی کو اختیار کیا اور بہترین تربیتی ماحول پیدا کیا۔

——— علماء کے اختلافی روش کے برخلاف معتدل اور متوازن حکمتِ عملی اختیار کی ۔

——— جدید و قدیم دونوں علمی سرچشموں سے سیراب ہوا۔ ایک طرف علامہ شبلی نے نادر و نایاب اساتذۂ فن علماء کو اپنی درسگاہ میں جمع کیا اور ان کی خدمات حاصل کیں اور دوسری طرف شبلی ہی کے ذریعے علی گڑھ اور جامعہ ازہر جیسے دارالعلوم سے استفادہ کیا

——— تعلیمی و تدریسی حیثیت سے بھی عالمِ اسلام سے رابطہ قائم رکھا اور تصنیفی و صحافتی انداز میں بھی اپنے رشتوں کو استوار کیا۔

——— تحقیقی و تصنیفی کاموں کا عمدہ معیار پیش کیا اور شروع سے آج تک اس کارِ نمایاں کو نہایت خوبی کے ساتھ اور معیاری انداز میں نبھانے کا شرف حاصل کیا۔ سید سلیمان ندوی سے لیکر سید ابوالحسن علی ندوی تک علم و فن اور تحقیق و تصنیف کے نادر و نایاب شاہکاروں کو قوم کے حوالے کیا۔ ندوہ کے علماء و فضلاء نے عالمگیر پیمانے پر سندِ قبولیت حاصل کرکے علومِ اسلامی کی بیش بہا خدمات انجام دیں ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

جس طرح دیوبند اور علی گڑھ مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں یعنی اگر ایک طرف دارالعلوم دیوبند نظریاتی اعتبار سے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا کٹر مخالف نظر آتا ہے تو دوسری طرف مدرستہ العلوم علی گڑھ اس کا ہر طرح مؤید، بالکل اسی طرح ندوہ اور جامعہ بھی مقاصد کے اعتبار سے پورب پچھم دکھائی پڑتے ہیں یعنی اگر ایک طرف ندوۃ العلماء پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے تو دوسری طرف جامعہ ملیہ شروع سے آج تک اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ جدید تعلیم میں قدیم تعلیم کی خصوصیات کو برقرار رکھا جائے ۔

تحریک عدم تعاون نے جس زمانہ میں "سرکاری تعلیم گاہوں" کا بائیکاٹ

کیا اس وقت اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اساتذہ و طلباء کو مصروف عمل رکھنے کے لیے قومی تعلیم گاہیں قائم کی جائیں۔ لیکن چونکہ قومی تحریک تعلیم پر ہندوؤں کی قائدانہ گرفت تھی اس لیے وہ زیادہ عرصہ تک اس پروگرام سے متفق نہیں رہ سکے اور اپنے حق میں ملّی تعلیم کے خواہاں ہوئے۔ اس ضمن میں مسلمان دانشوروں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے اس بات کی توقع کی کہ وہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی تنظیم کے حق میں ایثار کا مظاہرہ کرکے سرکاری گرانٹ مسترد کردے اور ملّی بنیادوں پر تنظیم نو کرلے۔ یہ منصوبہ علی گڑھ کے مزاج کے خلاف تھا۔ الغرض اس طرف سے مایوس ہوکر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے 1920 میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک ملّی تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا جس کی سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی۔ قابل غور امر یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کا تعلق دانش گاہ علی گڑھ سے اور شیخ الہند کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے ہے۔ گویا اس تحریک کی بناد و تاسیس میں۔ دیوبند اور علی گڑھ کے فارغین کے خون پسینے کے امتزاج اور ہم آہنگی کو حاصل ہوئی یا ترقی پسند اور قدامت پسند نظریات کے مجمع البحرین کو حاصل ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت کے ایک اہم تقاضے کے طور پر دونوں حضرات کے طریقۂ کار میں قومی و ملّی رنگ کو شمولیت حاصل رہی۔

1925 میں مسیح الملک حکیم اجمل خان کے مشورے سے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں پہلے قرول باغ میں اور پھر اوکھلا کے پاس جامعہ نگر کے نام سے اس کا قیام عمل میں آیا۔

—— جامعہ ملیہ اسلامیہ نے علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی جامعیت کو برقرار رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

—— انگریزی کی بجائے 'اردو' کو ذریعہ تعلیم MEDIUM — OF INSTRUCTION بنایا۔

—— جامعہ نے تعلیم کا رشتہ ملازمت کے حصول کی بجائے معیشت

کے دوسرے وسیلوں سے جوڑا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے صنعت و حرفت کی تعلیم کا بندوبست کیا اور تعلیم سے فراغت کے بعد پیشہ ورانہ ضرورت کے تقاضوں کو پورا کیا۔

— جامعہ نے سادگی اور قناعت پسندی کے عملی نمونے پیش کئے اور قومی مفادات کے حق میں ایثار و قربانی کی شاندار مثالیں قائم کیں۔

— جامعہ نے علمی و ادبی تحقیق کے بلند معیار قائم کئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا عبدالسلام قدوائی جیسے بلند پایہ صاحبان تصانیف جامعہ کی صحت مند فزا کی پیداوار ہیں۔

گذشتہ اوراق میں مختلف طریقہ تعلیم یا دانش کدہ تعلیم کی بابت حالات سابقہ و حاضرہ سے متعلق نظام تعلیم کی بحث میں پروفیسر محمد مجیب (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اپنے وقت کے ممتاز ماہر تعلیم) کی نشاندہی کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جو ضروری اور پُر معنی ہے اور حالات کی مناسبت سے مطابقت رکھتا ہے۔

" ہمیں ہر وقت یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہم اپنے آپ کو زمانے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہم نہ ایسی سختی کے ساتھ تقلید کر سکتے ہیں کہ ہماری زندگی کسی دوسرے کا چربہ بن جائے، نہ اتنی آزادی سے اجتہاد کر سکتے ہیں کہ قدروں کی ترتیب بگڑ جائے۔ ہمیں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ دین دنیا کے لئے اور دنیا دین کے لئے رکاوٹ نہ ہو بلکہ دونوں ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ ان کا رشتہ سمندر اور ساحل کا سا نہ ہو بلکہ دونوں ہمارے دلوں میں بڑے دریاؤں کی طرح آکر مل جائیں۔ اس طرح مل جائیں کہ انھیں الگ کرنا ممکن نہ ہو اور کوئی قوت ان کے بہاؤ کو روک نہ سکے۔" [۳۰]

۳ انگریزوں کی حکمت عملی

عمومی جائزہ

انگریزوں کی حکمت عملی جو سراسر SLOW POISONING POLICY تھی، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل قول سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے "ہمارا لائحہ عمل یہ ہوگا جسے ہم اس احساس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ بات ہماری قوت و اختیار میں ہے کہ ہم اہل ہند کو بتدریج سب سے پہلے اپنی زبان سکھائیں۔ پھر اس زبان کے ذریعے اپنے ادب کی آسان تخلیقات سے متعارف کرائیں جو متنوع موضوعات پر موجود ہیں۔ ہماری اس بات پر بے صبری سے چیں بہ جبیں نہ ہوا جائے۔ آہستہ آہستہ ہم اس کے ذریعے اہل ہند کو اپنے فلسفۂ حیات اور بالآخر اپنے مذہب تک لے آئیں گے۔ ان تمام کاموں کا حصول آہستہ آہستہ اور پوری خاموشی کے ساتھ اہل ہند کے گندے اور فرسودہ نظام کو نیست و نابود کر دے گا"۔ اس تعلیمی پالیسی کو لارڈ میکالے نے اپنی تمام قومی خبث باطن کے ساتھ مکمل کیا۔ اس نے صاف الفاظ میں اس مقصد تعلیم کا اظہار کیا کہ ہمیں ایسی نسل تیار کرنا ہے جو دیسی آبادیوں کے لئے ہمارے افکار و نظریات کی ترجمان ہو اور جو رنگ و نسل کے اعتبار سے بلاشبہ ہندوستان کی باشندہ ہو لیکن فکر و نظر اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے انگریز ہو۔ [۱۳]

دو رخی پالیسی

۱۔ تعلیم کے معاملے میں

انگریزوں نے برادران وطن کے ساتھ ایک پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں کے ساتھ دوسری۔ دونوں قوموں کے ساتھ یکساں رویہ اختیار نہیں کیا۔ برادران وطن کو جدید علوم کی تعلیم دی، نظام تعلیم کو خاص طور پر ان کے مطالبات اور ان کے مزاج کے مطابق بنایا۔ ہر طرح کوشش کی کہ ان کو تعلیم یافتہ اور مہذب بنایا جائے۔ دوسری طرف انگریزی حکومت کے متعدد اقدامات سے یہ فیصلہ کرنا قطعاً غلط نہیں کہ انگریزی استعمار نے دانستہ طے کیا کہ مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے دھکیلا جائے اور ناخواندہ بنایا جائے۔

1814 میں قوانین بازیافت (ACT OF RESUMPTION OF LAND) کے ذریعے سارے ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے اوقاف ضبط کر لئے گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جو کسی نہ کسی شکل

میں اوقاف کے بل پر چل رہا تھا خود بخود ختم ہو گیا ۔ ولیم ہنٹر لکھتا ہے کہ قوانین بازیافت مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے حق میں شاہ ضرب (MASTER STROKE) ثابت ہوا ۔ ایک ایک سال میں سات سو مدارس کے بند ہو جانے کی اطلاع پا کر نظامت تعلیم خوشی کا اظہار کرتی تھی ۔ [۳۲] قدیم تعلیم سے محروم کر دینے کا منصوبہ کامیابی سے نافذ کیا گیا ۔ جدید انگریزی اسکول میں تعلیم پانے کے مسلمان شوقین تھے وہاں ان کو داخلہ نہیں دیا گیا اور شوشہ یہ پھیلا دیا گیا کہ مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم کے خلاف کفر کے فتوے دے ہیں ۔ مزید پیش قدمی کر کے لارڈ میکالے نے 1835 میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت پر زبردست چوٹ ماری ۔ عربی فارسی کی تعلیم سارے ملک سے ختم کر دی ۔ ہزار سالہ نظام تعلیم کی بساط الٹ دی ۔ مسلمانوں کے تمام علوم و فنون صدیوں کی کوششوں کے نتیجے میں ان دو زبانوں میں محفوظ تھے اسان کی راہ مسدود کر دی ۔ اول روز سے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں عربی علمی زبان تھی اور فارسی سرکاری اور مراسلت کی زبان ۔ اس لئے یہ اقدام علمی اعتبار سے مسلمانوں کو ننگا کر دینے کے مترادف تھا ، جہالت کے سمندر میں غرق کر دینے کی کوشش تھی ۔ وہ تو خداوند کریم جزائے خیر دے اس وقت کے علماء کرام کو جنہوں نے خطرہ کی سنگینی کو بھانپ لیا اور اردو زبان کو علوم و فنون سے باثروت بنا دینے کے لئے کمر ہمت کس لی ۔ ایک صدی میں کسی زبان نے اس سرعت سے ترقی نہیں کی ہوگی جتنی اردو زبان نے کی ہے کہ وہ ہر اعتبار سے عربی فارسی کا نعم البدل ثابت ہوئی ۔ [۳۳]

۲ ۔ قومی شعور کے معاملے میں

قومی شعور کی تعلیم دینے میں انگریزوں نے برادران وطن پر بے حد فیاضی سے کام لیا ۔ ان کے اندر قومی وحدت کا کوئی تصور نہیں تھا نہ کوئی قومی تاریخ تھی ۔ انگریزوں نے ان کو تاریخ مرتب کر کے دی ۔ سیاحوں کے بیانات ، کتبے ، کھنڈرات ، سکے وغیرہ کو جوڑ کر ان کی تاریخ مرتب کی ۔ سنسکرت کی قدیم کتابوں کو شائع کیا ۔ ہندی 'بولی' تھی ۔ اس کی تشکیل نو فورٹ ولیم کالج میں کی اور 'زبان' بنایا ۔ غرض کہ ہر طرح ان کی خدمت کر کے ان کو ایک قوم بنایا ، ایک وحدت میں منسلک کرنے کی کوشش کی اور ان کے اندر قومی شعور کی آبیاری کی ۔ [۳۴]

انگریز نے مغربی لباس پہنا کر ان کے ابھرتے ہوئے قومی شعور کو مجروح نہیں کیا بلکہ قدیم ہندوانہ لباس کے ساتھ ہی ان کو اعلیٰ تعلیم دی ۔ راجہ رام موہن رائے ، سوامی دیویکانند ، رابندر ناتھ ٹیگور ، گوپال کرشن گوکھلے ، پنڈت موتی لال نہرو ، پنڈت جواہر لال نہرو ، موہن داس کرم چند گاندھی وغیرہ کی

تصویریں دیکھیے سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے قومی لباس میں نظر آتے ہیں۔ کسی نے اپنا قومی لباس ترک نہیں کیا اور اپنی قوم اور قومی روایات سے بدستور جڑے رہے۔ ان کے اندر یہ خیال جاگزیں ہوا کہ ہم ایک عظیم قوم ہیں، اپنے قدیم لباس کے ساتھ ہی ہم جدید علوم کی تحصیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح انگریز نے ان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر کی، وحدت قومی کو تقویت دی، قومی شعور کی آبیاری کی، اسے مجروح نہیں کیا۔[35]

اس کے برخلاف مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں نے دوسرا معاملہ کیا۔ ان کے اندر قومی شعور کو ہر طرح پست کیا، ابھرنے نہیں دیا۔ راجہ رام موہن رائے کے قائم کردہ کالج کا نام [illegible] رکھا گیا جبکہ سر سید احمد خان کے قائم کردہ کالج کا نام MOHAMMADAN ANGLO — ORIENTAL COLLEGE رکھا گیا۔ درآں حالیکہ مسلمان MOHAMMADAN کے لفظ کو پسند نہیں کرتے۔ کسی ہندو کالج کے امتیازی نشان میں تاج برطانیہ کو شامل نہیں کیا گیا مگر علی گڑھ کالج کے امتیازی نشان میں چاند تارے اور کھجور کے ساتھ تاج برطانیہ کا بھی اضافہ کیا گیا تاکہ برطانیہ کی وفاداری کا جذبہ تعلیم یافتہ مسلمان کے دل میں اس طرح مستحکم ہو جائے جس طرح اسلام کی وفاداری مستحکم ہے۔ عمارات میں جگہ جگہ انگریزوں کے نام اور نقوش کندہ ہیں۔ اس کا آغاز ملکہ وکٹوریہ کے جشن تاجپوشی کے دن ہوا۔ والسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں سے ہوا۔ انگریزی لباس لازمی قرار دیا گیا۔ خود بانئ کالج نے کوٹ اور پینٹ کا لباس اختیار کر لیا۔[36]

ان اقدامات کے غیر شعوری اثرات مسلمان طلباء پر یہ پڑے کہ اگر جدید علوم کی تحصیل کرنی ہے، اگر انگریزی زبان پڑھنی ہے تو پھر اپنا قومی لباس ترک کرنا ہوگا اور انگریزی لباس زیب تن کرنا ہوگا۔ یہاں سے یہ بات بھی ذہن میں بیٹھ گئی کہ جو لوگ قومی لباس پہنتے ہیں وہ سب جاہل ہیں اور ایک طرح کی نفرت ان کے خلاف دل میں بیٹھ گئی۔ مسلمان قوم کے تعلیم یافتہ افراد اپنی قوم سے کٹ گئے۔ اس وقت سے مسلمان قوم مسٹر اور ملا کے دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی۔ قوم کی وحدت منقسم ہو گئی اور بڑی حد تک دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ لباس ترک کرنے کے بعد جدید طبقہ اپنے ماضی سے کٹ گیا، اپنی تہذیب سے کٹ گیا۔ کیا وہ خود کو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالحق دہلوی کا وارث کہہ سکتا ہے، کیا وہ خود کو عبدالقادر بیدل اور

اور ناصر علی سرہندی کا وارث کہہ سکتا ہے ؟ نہیں ۔ کیا ان کے اندر قومی افتخار
و اعزاز کا تصور پیدا ہو سکتا ہے ؟ نہیں ۔ کٹی پتنگ کی طرح قوم کے اندر ایک
طبقہ پیدا ہو گیا اور بس ۔ الغرض انگریز نے ہر طرح کوشش کی کہ مسلمانوں کے اندر
قومی شعور نہ ابھرنے پائے ۔ [۳۷]

---

[۲۶] تا [۲۹] اقتباسات اور نفس مضمون ماخوذ از نظام تعلیم — پروفیسر خورشید احمد

[۳۰] پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر الیاس شاہدی ص ۱۸

[۳۱] لارڈ میکالے کی سفارشات پر مبنی تعلیمی پالیسی جو BENTINKS RESOLUTION کے نام سے موسوم ہے مورخہ ۷ مارچ 1835 ماخوذ از نظام تعلیم — پروفیسر خورشید احمد

[۳۲] تا [۳۷] اقتباسات اور نفس مضمون ماخوذ از مقالہ / تعلیم کیا ہوتی ہے اور اسلامی تعلیم کیا ہے — پروفیسر سید محمد سلیم
سہ روزہ دعوت کا خصوصی نمبر 'تعلیم اور مسلمان' مورخہ ۱۶ دسمبر 1997ء ص ۱۲۶-۱۳۰